داعیٔ کبیر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ندوۃ العلماء لکھنؤ

ترجمہ : مولانا شمس الحق ندوی استاد ندوۃ العلماء

مصنوعی تہذیبیں

ایک صاحب شعور مومن کی نظر میں

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایک عربی تقریر کا ترجمہ

حضرت محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی گزشتہ مہینے محرم کے آغاز میں امارت عربیہ متحدہ کے مرکز ابوظہبی کے رئیس قضاء شرعی سماحۃ الشیخ عبدالعزیز آل مبارک کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے تھے، ۳؍ محرم کو وہاں کے ایک بڑے اجتماع میں جو گورنر ہاؤس میں منعقد کیا گیا تھا جس میں اہل علم، اساتذہ و اصحاب ثقافت اور مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے حضرات کی بڑی تعداد شریک تھی۔ مولانا نے خطاب فرمایا جو وہاں کی زبان عربی میں تھا۔ اس خطاب کو ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے کاغذ پر منتقل کیا گیا، یہ اصل عربی خطاب دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ماہنامہ "البعث الاسلامی" کے صفر کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کا ترجمہ دارالعلوم کے استاذ مولانا شمس الحق صاحب نے فرمایا ہے۔ اور ہم اسے بشکریہ "الفرقان" پیش کر رہے ہیں۔

"ادارہ"

★

حمد و ثنا کے بعد ــــ محترم دوستو اور بھائیو!

عرب مورخین نے تاریخ اسلام کے ایک واقعہ کا بار بار ذکر کیا ہے جس کو ہم جلدی میں سرسری طور پر پڑھ جاتے ہیں، حالانکہ یہ واقعہ بڑا توجہ طلب، معنی خیز اور حکمت سے لبریز ہے، اور اس کا مطالعہ ہمیں بڑی سنجیدگی اور غور سے کرنا چاہیے، اس وقت میں اپنی گفتگو کی ابتدا اسی واقعہ سے کرتا ہوں، اس لئے کہ اس کا ہمارے موضوع سے بڑا گہرا اور دور رس تعلق ہے، یہ واقعہ موجودہ بے جان اور کھوکھلی تہذیبوں کے بارے میں ایک باشعور و غیرت مند مومن کے نقطۂ نظر کو واضح و متعین کرتا ہے۔ تاریخ اسلام کے مطالعہ میں یہ واقعہ آپ کی نظر سے گذرا ہوگا، میں نے جب اس واقعہ کو پڑھا اور اسکی وسعت و گہرائی پر غور کیا

تو تصویر حیرت بن کر رہ گیا، معلوم نہیں اس واقعہ کے مطالعہ میں آپ کے ساتھ یہ بات پیش آئی یا نہیں؟ ایسا بہت ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی واقعہ کو پڑھ کر عجیب وغریب نتائج نکالتا ہے، اور اس کی وسعت وگہرائی پر انگشت بدنداں ہو جاتا ہے، دوسرے بہت سے لوگ اس کو روزمرہ میں پڑھ جاتے ہیں ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا، چاہے وہ پہلے پڑھنے والے سے زیادہ وسیع المطالعہ ہوں اور تاریخ پر ان کی گہری نظر ہو۔

اس واقعہ کو عرب مؤرخین نے اپنے مزاج وعادت کے مطابق بڑی سادگی اور اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے، اس کی تفصیل وگہرائی میں نہیں گئے، وہ بیان کرتے ہیں کہ ایرانی سپہ سالار رستم نے ہمارے امیر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے جو ایرانی محاذ پر اسلامی فوج کے کمانڈر تھے درخواست کی کہ وہ مسلمانوں میں سے ایک شخص کو بھیجدیں، جس سے وہ اس جنگ کے اسباب ووجوہ معلوم کرے جو بے سان وگمان چھڑ گئی ہے، ان کے تو حاشیۂ خیال میں بھی یہ نہ تھا کہ عرب کے یہ بدو جنہیں تن ڈھکنے کے لئے کپڑا اور پیٹ بھرنے کے لئے خشک روٹی بھی نصیب نہیں ان سے اس طرح برسرپیکار ہوں گے، عرب تو صدیوں سے دنیا سے الگ تھلگ صحرا میں زندگی گذارنے پر قانع تھے، پھر اچانک یہ صورت حال کیونکر پیش آئی، یہ لوگ تو دنیا سے الگ تھلگ اور سادہ زندگی گذارنے پر قانع تھے، انہیں ملک گیری اور پاس پڑوس کی حکومتوں پر شکر کشی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن اپنی طویل تاریخ میں جب اس وقت وہ روم و فارس سے جنگ آزما ہوئے تو دنیا کی توجہ کا مرکز بن گئے اور اہل روم وایران جن سے براہ راست مقابلہ تھا حیران و ششدر رہ گئے کہ یہ بلائے ناگہانی کہاں سے آپڑی۔

بہرکیف حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ربعی بن عامر کو رستم کے پاس بھیجا، رستم نے اپنے دربار کو ایسا سجایا تھا، بلکہ مرعوب کرنے کے لئے ایسے غیر معمولی طریقے اپنائے تھے کہ دیکھنے والا حیران رہ جائے۔ اس نے اپنے دربار کو سنہرے گاؤ تکیوں، ریشمی فرش وفروش اور جگمگاتے ہوئے ہیرے جواہرات سے سنوار رکھا تھا، غرض یہ کہ زیب وزینت کے جو بھی اسباب ہو سکتے ہیں وہ سب مہیا کر لئے تھے اور خود تاج پہن کر سونے کے تخت پر بیٹھا تھا، اس حال میں حضرت ربعی بن عامر دربار میں داخل ہوئے وہ صحرا سے نکل کر آئے تھے ایسے ٹیپ ٹاپ اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی ایسی سجاوٹ سے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا، ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اس آن بان کو دیکھ کر وہ دم بخود رہ جاتے، مگر انہوں نے تو کچھ اور ہی سبق پڑھا تھا، ان کے دل کی دنیا اس دربار کی جگمگاہٹ سے کہیں زیادہ تابناک ومنور تھی، دربار کا

اطمینان کے ساتھ جاکر بیٹھ گئے جیسے اپنے کسی بے تکلف رفیق دوست کے ساتھ بیٹھے ہوں

گفتگو شروع ہوئی رستم نے پوچھا آپ کے آنے کا مقصد اور غرض وغایت کیا ہے۔؟ حضرت ربعی بن عامرؓ نے نہایت سنجیدگی ومتانت کے لہجہ میں فرمایا۔ ہم کو اللہ نے بھیجا ہے کہ بندوں کو بندوں کی عبادت سے نکال کر صرف اللہ کی بندگی کی طرف بلائیں اور ان کو دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعت اور کشادگی کی طرف لائیں۔ مختلف مذاہب کے ظلم وجور سے نجات دلاکر اسلامی عدل وانصاف میں داخل کریں، خدا نے ہم کو اپنا دین لیکر اپنی مخلوق کیطرف بھیجا ہے کہ ان کو خدا کی طرف بلائیں اور اسکی دعوت دیں۔

دوستو اور بھائیو! میرا یہ منشا نہیں کہ اس سادہ ومعنی خیز واقعہ کے تینوں اجزاء کی تشریح و وضاحت کروں میں اس وقت قصہ کے صرف ایک جز کی وضاحت وتشریح کرنا چاہتا ہوں، اس باشعور مردِ مومن نے رستم کو اس وقت مخاطب کیا جب وہ شان وشوکت اور رعب و دبدبہ کی انتہائی منزل پر ہے، راحت و آسائش کے سارے اسباب مہیا تھے۔ مگر یہ بندۂ خدا کہتا ہے کہ "دنیا کی تنگی سے اسکی وسعت کی طرف لائیں"۔ مجھے ان کے اس جملہ پر کہ "بندوں کی عبادت سے نکال کر اللہ کی عبادت کی طرف بلائیں۔" حیرت وتعجب نہیں نہ اُن کے اس جملے پر حیرت ہے کہ "مذاہب کے ظلم وجور سے نکال کر اسلام کے عدل وانصاف میں داخل کریں۔" یہ تو ان مسلمانوں کے لئے ایک بدیہی حقیقت تھی جن کے دلوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کا عقیدہ بٹھایا اور ایمان ویقین کا بیج بویا تھا، اور کفر وشرک اور فسق وفجور کو ان کے لئے مبغوض بنا دیا تھا۔ وہ بندگانِ خدا شرک وبت پرستی اور انسان کی اپنے ہی جیسے انسان کے سامنے سرخمیدگی کو ذلت وحقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، ان کو اس سے گھن آتی تھی، ان کا ذوقِ سلیم اس سے ابا کرتا تھا۔

حضرت ربعی بن عامرؓ پر یہ حقیقت بھی عیاں تھی کہ فارس کے بادشاہوں اور حکمرانوں نے لوگوں کو غلام بنا رکھا ہے، اور ان کے ساتھ وہ برتاؤ کرتے ہیں جو خدا بندوں کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ برتاؤ نہیں جو آقا غلام کے ساتھ کرتا ہے۔ لوگ ان کے سامنے جھکتے ہیں زمین بوس وسجدہ ریز ہوتے ہیں، ان کے عوام کا یہ عقیدہ تھا کہ بادشاہوں اور حکام کا طبقہ عام انسانوں سے بلند وبرتر اور مقدس ہے، ان کی رگوں میں خدائی خون جاری ہے۔

اور ان مردانِ حق کا ایمان وعقیدہ یہ تھا کہ پاک ومقدس صرف خدا کی ذات ہے، اور دین اسلام ہی برحق وسچا خدائی دین وقانون ہے، اس کے علاوہ جو بھی ادیان ومذاہب پائے جاتے ہیں وہ حقیقت سے بہت دور اور ظلم وجور کا سرچشمہ بن چکے ہیں، وہ انسانوں کو انسانوں ہی کا غلام وپرستار بناتے ہیں، انسانی کنبہ کو دینی پیشواؤں اور راہبوں کے تابع کرتے ہیں اور ان کو ایسی پابندیوں، بیڑیوں اور پھندوں میں جکڑتے

ہیں جس کا خدا کی طرف سے کوئی ثبوت نہیں ۔

ان بزرگانِ خدا نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو سنا اور پڑھا تھا۔ الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوبا عندھم فی التوراۃ والانجیل یأمرھم بالمعروف وینھاھم عن المنکر ویحلّ لھم الطیبات ویحرّم علیھم الخبائث ویضع عنھم إصرھم والاغلال التی کانت علیھم ــــ (سورۃ اعراف آیۃ ۱۵۷)

جو لوگ کہ ایسے رسول نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جن کو وہ لوگ اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں وہ ان کو نیک باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں، اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال بتلاتے ہیں، اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں۔ اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو دور کرتے ہیں۔

انہوں نے خدا کا یہ فرمان بھی سنا تھا: یاایھا الذین آمنوا إن کثیراً من الاحبار والرھبان لیأکلون أموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل اللّٰہ۔ (سورہ توبہ آیۃ ۳۷) اے ایمان والو بہت سے عالم و درویش لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں، اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

انہوں نے یہ آیاتِ قرآنی پڑھی تھیں اور ان پر ایمان لائے تھے اور جن ادیان و مذاہب سے وہ واقف تھے مثلاً روم کے نصرانی، فارس کے مجوسی اور مدینہ کے یہودی، ان کے اندر قرآن کے بیان کئے ہوئے ان حقائق کو دیکھ رہے تھے۔ ان آیات و تعلیمات کی روشنی میں اگر ربعی بن عامرؓ یہ فرماتے کہ ہم بندوں کو دنیا کی تنگی سے آخرت کی وسعت کی طرف بلانے اور نکالنے کے لئے آئے ہیں تو حیرت کی بات نہیں تھی اس لئے کہ یہ انہوں نے پڑھا تھا اور اس آخرت پر ایمان رکھتے تھے جسکو وسعت لامحدود اور بقاء دوام حاصل ہے، وہ اس جنّت پر ایمان رکھتے تھے جس کی نعمتوں، راحتوں اور وسعت کی کوئی حد نہیں۔

انہوں نے قرآنِ کریم میں جس کا ایک ایک فرمان ان کے رگ وپے میں جاری وساری تھا، یہ پڑھا تھا کہ لپکو اور بڑھو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس جنّت کی طرف جسکی وسعت زمین و آسمان کی وسعت کے برابر ہے۔ جو احکام خداوندی کا پاس ولحاظ رکھنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ انہوں نے غزوۂ بدر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا تھا کہ اس جنّت کی طرف بڑھو جسکی وسعت زمین و آسمان کے برابر ہے اور یہ بھی فرماتے سنا تھا کہ جنت کے اندر ایک کوڑے بھر کی جگہ بھی دنیا وما فیہا سے افضل و بہتر ہے۔ اس نبوی تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں اگر وہ کہتے کہ ہم ان کو دنیا کی تنگی سے آخرت کی وسعت کیطرف نکالنے آئے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی، اس لئے کہ ان کو یہی سبق پڑھایا گیا تھا۔

تعجب وحیرت ان کے اس جملہ پر ہے کہ " دنیا کی تنگی سے اسکی وسعت کیطرف لائیں " وہ کون سی تنگی تھی جس میں اہل فارس گھٹ رہے تھے، اور وہ کیا وسعت تھی جو عربوں کو حاصل تھی کہ ربعی بن عامرؓ نے ان سے بے تکلف فرمایا کہ اے بدنصیب و دکھ درد کے مارے ہوئے ایرانیوں ہم تم کو دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت وکشادگی میں لانا چاہتے ہیں۔

کیا عرب جس حال میں تھے وہ وسعت کہلانے کے لائق تھی، اور ایرانیوں کو جو عیش وتنعم حاصل تھا اسکو تنگی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔؟ پھر ان کے اس جملے کا آخر راز کیا ہے؟ آئیے ہم تاریخ کے صفحات میں اس حقیقت کو تلاش کریں، اس لئے کہ تاریخ دوٹوک حقیقت پیش کرتی ہے، عربوں، رومیوں اور ایرانیوں کی تاریخ مرتب ومدون ہے۔ اس میں شکوک وشبہات کی گنجائش نہیں اس کو سچے اور ثقہ راویوں نے بیان کیا ہے۔ اسکو مختلف روایتوں اور معتبر طریقوں سے تائید بھی حاصل ہے۔ اگر عرب وسعت وکشادگی اور خوشحالی کی زندگی گذار رہے تھے تو یہ بات ان راویوں سے پوشیدہ ومخفی نہیں تھی کہ تاریخ اس سے سکوت اختیار کرتی، اسی طرح ایرانی اگر عسرت وتنگی کی زندگی گذار رہے تھے تو یہ بات بھی ان سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ تاریخ شاہد ہے، اور تمام مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ رومی وایرانی نہایت خوشحالی اور فارغ البالی کی زندگی گذار رہے تھے بلکہ دل کھول کر دادِ عیش دے رہے تھے، دنیا کا دامن ان کے لئے وسیع وکشادہ تھا، اور ان کی زندگی سامانِ راحت وآسائش سے بھری ہوئی بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ سدا بہار تھی۔

دوسری طرف عربوں کی زندگی اس کے بالکل برعکس تھی، وہ سادہ اور موٹی جھوٹی زندگی گزارنے کے عادی تھے، یہ حضرت عمر فاروقؓ کا عہد خلافت تھا اور مسلمان اپنی عربی اسلامی فطرت پر قائم تھے، تہذیب و ثقافت کا دائرہ ابھی تک اتنا وسیع وپیچ نہیں ہوا تھا جتنا بعد کے زمانہ میں ہوا۔ خود خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ کی زندگی بھی نہایت سادہ وزاہدانہ تھی اور عام مسلمانوں کی بھی۔

عربوں کی اس زندگی کو رومی وایرانی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور انہیں بدوی اور پسماندہ سمجھتے تھے انہیں ان کی عسرت وتنگی پر ترس آتا تھا جب تصویر کا صحیح رخ یہ ہے اور عربوں کی وسعت اور ایرانیوں کی تنگی کی حقیقت وہ ہے جسکی تفصیل اوپر گذری، تو ہم اس مردِ مومن کے جملہ پر (کہ ہم تم کو دنیا کی تنگی سے اسکی وسعت کی طرف نکالنے کے لئے آئے ہیں۔) غور کریں اسکی گہرائی میں جائیں اور جائزہ لیں کہ اہل فارس کس تنگی وگھٹن میں مبتلا تھے جس پر اس عرب مسلمان نے اظہارِ افسوس کیا، اور وہ کون سی وسعت وفراخی تھی جو عربوں کو میسر وحاصل تھی جس پر اس صحابی جلیل نے تشکر وامتنان کے لہجہ میں اظہار فخر کیا۔ کیا ان کا قول شاعرانہ لن ترانی اور مبالغہ پر مبنی تھا، حاشا وکلا مبالغہ آرائی عربوں کا مزاج نہیں تھا وہ حقیقت پسند تھے، اسلام نے امت مسلمہ

کے کسی فرد کو اسکی اجازت نہ دی تھی کہ وہ فخر و غرور کا مظاہرہ کرے اور شاعرانہ مبالغہ آمیزی سے کام لے وہ مبالغہ آمیزی اور مہمل و بے معنی باتیں کرنے سے بہت بلند و برتر تھے، بے لاگ و دوٹوک بات کرنا ان کی سرشت و مزاج میں داخل تھا۔

سب حقیقت یہ ہے تو پھر آخر وہ کون سی تنگی تھی جو ان کو نظر آرہی تھی، وہاں کی صورت حال تو یہ تھی کہ ایران کی اس عظیم و پرشکوہ شہنشاہی کی حدود میں داخل ہوتے ہی ان کی شان و شوکت آرائش و زیبائش اور انواع و اقسام کے ماکولات و مشروبات کو دیکھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آتا، انہوں نے وہاں عیش و تنعم کے گرانقدر ساز و سامان، تہذیب و تمدن کی پوری جلوہ گری، ساز و نغمہ کی سحر آفرینی و فتنہ سامانی دیکھی تھی۔ آنکھوں کو خیرہ و چکا چوند کر دینے والے اس تمدن کو دیکھا تھا جو عروج و ترقی کے آخری نقطہ پر تھا، اہل فارس نے اپنی ذہانت و نکتہ آفرینی اور صدیوں کے تجربہ اور بیشمار ساز و سامان اور زبردست فتوحات سے اس میں چار چاند لگا دئے تھے، اس ملک میں بڑے بڑے شہر اور پرشوکت عمارتیں تھیں، ہرے بھرے باغات اور دلفریب پارک تھے، خوبصورت و دیدہ زیب بازار تھے، انوکھے اور دور دراز ملکوں سے حاصل کئے ہوئے سامان تھے۔

دوستو اور بھائیو! یہ عرب آخر کس قماش و کس خمیر کے لوگ تھے جو ان دلکش مناظر و مظاہر کی خاطر میں نہ لاتے تھے، اور یہ حسن و جمال جسے دیکھ کر انسان دیوانہ ہو جائے ان کی نگاہوں میں جچتا نہیں تھا، ان کے اس جملہ پر کہ "اے اہل فارس ہم کو خدا نے بھیجا ہے کہ تم کو دنیا کی تنگی سے اسکی وسعت کی طرف لائیں" ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ لیکن اگر ہم ذرا غور کریں اور وسعت و تنگی کے ان کے معیار کو سمجھ لیں تو یہ حیرت دور ہو جائے گی وہ مردان خدا ان بادشاہوں اور احکام کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے عقل مند و دانا انسان اس گڑیا کو دیکھتا ہے جس کو خوبصورت و عمدہ کپڑے پہنا دئے گئے ہوں، ربعی بن عامرؓ ان امرا و حکام کو ان مورتیوں کی طرح دیکھ رہے تھے جو بڑی مہارت سے بنائی گئی ہوں اور ان کے بنانے والوں نے اچھی طرح ان کے نوک و پلک درست کئے ہوں، مگر مورتی تو مورتی ہی ہے، پتھر کی ہو یا سیمنٹ و چونے کی، نہ اس میں روح و زندگی ہے نہ چلنے پھرنے کی قوت و طاقت، ایرانی امرا و حکام کی حالت اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔

حضرت ربعی بن عامرؓ لشکر اسلام کے ایک فرد تھے وہ رستم کو اس نظر سے دیکھ رہے تھے جیسے سونے کے پنجرے میں کوئی پرندہ پلا ہوا ہو، اسی طرح کسریٰ (یزدجرد) جس کو انہوں نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا ان کے نزدیک ایک بلبل اور مور یا کسی اور خوبصورت چڑیا کی طرح تھا، ہے وہ بہرحال قید میں۔

یہ چڑیا پنجرے میں رہتی ہے، پنجرا سونے کا ہے اس کی تیلیاں سونے کی ہیں۔ چڑیا جن برتنوں میں کھاتی پیتی ہے وہ بھی سونے کے ہیں۔ مگر وہ کھلی ہوئی فضا میں آزادی کے ساتھ اڑنے اور پر ہلانے کی نعمت سے محروم ہے۔

آپ بتائیں کہ کوئی بھی انسان جو زندگی کی قیمت اور حقیقت سے واقف ہے۔ آزادی و شعور کی لذت سے واقف ہے۔ علم و عقل کی قیمت سے واقف ہے، کیا یہ انسان جس کو خدا نے انسانیت کا شرف بخشا ہے وہ اس مقید پرندے کو رشک و لالچ کی نظر سے دیکھے محض اس لئے کہ وہ سونے کے پنجرے میں ہے اور یہ کچے مکان بلکہ اون کے خیمہ میں رہتا ہے، بلکہ ہم اس سے بھی آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ کیا ہم کسی پالتو کتے پر رشک کریں گے؟ وہ کتا جسے اس کا یوروپین آقا عمدہ عمدہ کھانے اور میوے کھلاتا ہے۔ اس کو دودھ پلاتا ہے اسکو سونے کا ٹیکا پہناتا ہے، اس کو نرم و گداز بستر پر سلاتا ہے۔

دوستو اور بھائیو! حضرت ربعی بن عامرؓ رستم، کسریٰ (یزدجرد) اور ایرانی حکومت کو بالکل اسی نظر سے دیکھ رہے تھے جس نظر سے ہم پالتو پرندہ کو سونے کے پنجرے میں دیکھتے ہیں یا کسی یوروپین کے پالتو کتے کو اسکی گود میں اور موٹر میں دیکھتے ہیں۔

محترم دوستو اور بھائیو! اس کا راز یہ تھا کہ حضرت ربعی بن عامرؓ جس دین پر ایمان رکھتے تھے، جس دعوت کے حامل تھے، وہ جس شخصیت کے مالک تھے اور جس خدا کے تابع فرمان تھے، وہ قرآن جس کو انہوں نے پڑھا تھا اور جو ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر چکا تھا اس پر ان کو ناز تھا ان کی ایک ایک رگ میں ایمانی حرارت کی لہر دوڑ رہی تھی وہ ان اقدار و معانی اور ان حقائق پر نازاں تھے جو اس ظاہری حسن و جمال سے کہیں بلند تھے، یہی وجہ تھی کہ ایرانیوں کا یہ سحر آفریں تمدن ان کو متاثر نہ کر سکا اور اسکی فتنہ سامانیاں ان پر اپنا جادو نہ چلا سکیں، وہ اس حقیقت کو جانتے تھے کہ رستم چاہے جتنا بڑا سپہ سالار اور قائد و حکمران ہو مگر وہ آگ کی پوجا کرتا ہے، وہ اپنے نفس کا غلام ہے ایسے ہی جیسے اپنے آقا (یزدجرد) کا غلام ہے اور اپنی عادت و خواہشات کا غلام ہے۔

مسئلہ صرف رستم یا کسی ایک جنرل یا گورنر کا نہیں تھا بلکہ تمام اہل فارس کا اپنے آقاؤں کے ساتھ بشمول "یزدجرد" یہی معاملہ تھا، یزدجرد نہیں سمجھتا تھا کہ وہ اپنی خواہشات کا غلام ہے یا اپنے غلاموں کا غلام ہے کہ ان کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا تھا، اسکی نقل و حرکت انہیں کے کاندھوں پر ہوتی تھی، وہ کسی اعتبار سے بھی ایک آزاد انسان نہ تھا، بلکہ وہ ایسا انسان تھا جسکو خواہشات نے غلام بنا رکھا تھا، عادات و اطوار نے غلام بنا رکھا تھا۔ رسم و رواج نے غلام بنا رکھا تھا۔ وہ ادنیٰ حیوانی جذبات کا غلام تھا، آپ کو معلوم ہے

کہ بادشاہ "یزدجرد" ان دو بڑے بادشاہوں میں سے ایک تھا جنہوں نے دنیا کے متمدن و ترقی یافتہ حصوں کو تقسیم کر لیا تھا۔ ایران کا "کسریٰ" روم کا "قیصر"۔

اسلامی فتوحات کے سلسلے میں تاریخ کا میرا تازہ مطالعہ یہ ہے کہ ایرانی بادشاہت رومی بادشاہت سے بڑھی ہوئی تھی، ہندوستان کے متعدد صوبے ایرانیوں کے زیر فرمان تھے، ان میں سے بعض ایسے صوبے بھی تھے جو ہندوستان کے اندرونی علاقہ میں واقع تھے۔ لیکن اس صاحب شان و شوکت بادشاہ کے بارے میں تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب وہ اپنے پایۂ تخت "مدائن" سے جان بچا کر بھاگا ہے اور پناہ گزینی و فرار کی حالت میں تھا اس وقت بھی اپنے ساتھ ایک ہزار باورچی لئے ہوئے تھا۔ ایک ہزار باورچی۔ کیا آپ کو یقین آئے گا۔؟ اور ایک ہزار "گویئے" اس کے ساتھ شکروں اور چیتوں کی دیکھ بھال کرنے والے ایک ہزار خدام بھی تھے، اس کے باوجود وہ نہایت رنج و غم کے ساتھ آہ سرد بھر کر کہتا تھا کہ افسوس میں اپنے ساتھ خدم و حشم اور کارکنوں کی تھوڑی تعداد لے سکا۔ اور لوگوں سے کہتا تھا کہ میں تعزیت اور دلجوئی کا مستحق ہوں، کیا ایسے شخص کو آزاد و خوش بخت کہا جا سکتا ہے۔؟ خود مختار و با ارادہ کہا جا سکتا ہے۔؟

مورخین نے لکھا ہے کہ اسی حالت فرار میں جب اس نے ایک بوڑھی عورت کے یہاں پناہ لی اور بڑھیا نے اس کو کھانا پیش کیا اور یہ بھانپ کر کہ یہ کوئی بادشاہ و معزز شخص ہے۔ اظہار افسوس کیا۔ اس نازک گھڑی میں بھی جبکہ جان کے لالے پڑے تھے یزدجرد نے کہا کہ مجلس رقص و سرود کے بغیر یہ کھانا میرے حلق سے اتر نہیں سکتا، ان کی خواہشات کی بندگی و غلامی اور ناروا عادات کی پابندی اس درجہ کو پہنچ چکی تھی کہ وہ طاؤس و رباب کے بغیر کھانا نہیں کھا سکتے تھے، ہمیں یاد ہے کہ اہواز کا بادشاہ "الہرمزان" جب قید ہوا، اور خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ کی خدمت میں مدینہ منورہ لایا گیا تو اس وقت حضرت عمرؓ مسجد کے اندر اپنی ٹوپی کا تکیہ بنائے ہوئے سو رہے تھے، لوگوں کی آوازیں سن کر بیدار ہو گئے اور "ہرمزان" و حضرت عمرؓ کی گفتگو شروع ہوئی دوران گفتگو میں ہرمزان کو پیاس لگی اور اس نے پانی مانگا، ایک موٹے سے بڑے پیالے میں پانی لایا گیا۔ پیالہ کو دیکھ کر ہرمزان نے کہا کہ میں پیاسا مر جاؤں گا مگر اس جیسے بھدے پیالہ میں پانی نہیں پی سکتا۔ پھر دوسرے پیالہ میں پانی لایا گیا تو اس نے پانی پیا۔

اس موقع پر حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھیوں کو نصیحت کی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو اسلام کی نعمت عطا فرمائی، تم کو خدا نے اسلام کی وہ دولت عطا فرمائی جس نے تم کو ہزار بندگیوں سے نجات دی، تمہیں ان بتوں سے نجات دی جنہیں انسان خود بناتا ہے، اپنے ہاتھوں سے تراشتا ہے، اور اسی کا غلام بن جاتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: أتعبدون ما تنحتون۔ کیا تم ان کو پوجتے ہو جنہیں

خود تمہارے ہاتھوں نے بنایا ہے۔

دوستو! ہماری بہت سی ایسی عادتیں ہیں جن کو ہم خود اختیار کرتے ہیں اور پھر اس کے پابند و غلام بن جاتے ہیں، انسان اس وقت تک معزز نہیں ہو سکتا جب تک ایک خاص طرز کے مکان میں نہ رہے، مخصوص معیار کا کپڑا نہ پہنے، تراش خراش و ٹیپ ٹاپ کا لحاظ نہ رکھے، اس کے پاس فلاں فلاں ساز و سامان، فرنیچر اور لباس ہونا چاہئے، ہم جس زمانہ کی بات کر رہے ہیں اس میں یہی سب تو ہو رہا تھا جو آج ہم کر رہے ہیں۔ ایرانی کسی بڑے آدمی کو جس کی ٹوپی ایک لاکھ سے کم کی ہو عار دلاتے تھے، اور جو متوسط درجہ کا ہوتا اس کی ٹوپی پچاس ہزار کی ہوتی ان کے رؤسا کا صرف پٹکا پچاس ہزار کا ہوتا تھا، یہ عرف و معیار لوگوں کی ایجاد ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس کا پابند نہیں بنایا۔

یہ مغربی تہذیب و تمدن، خود ساختہ رسم و رواج، بے معنی پابندیاں اور گڑھی ہوئی اصطلاحات جن کو اہلِ یورپ نے اور ان کے وفادار شاگردوں نے خود سے اپنے اوپر لاد لیا ہے، اس کا سرچشمہ کیا ہے، یہ پابندیاں کہاں سے آئیں جن کو ہم نے ضروری سمجھ لیا ہے، آج ہم اس مغربی تہذیب کے سامنے اس سراب صحرا اور حباب دریا کے سامنے بلکہ صحیح معنوں میں اس لاشہ بے جان و متعفن کے سامنے جسے یورپ اپنے کاندھوں پہ لئے پھر رہا ہے اور سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اسے کہاں ڈال دے۔ ہم اس کے سامنے سپر انداز ہو گئے، اور فطرت کی اس سادگی سے دور و تہی دست ہو گئے جس میں عرب مشہور تھے اور جو امت مسلمہ کے پیشواؤں اور مربیوں نے مسلم قوم کو عطا کیا تھا، جیسے حضرت عمرؓ بن الخطاب[1]، حضرت ربعیؓ بن عامر اپنی دوربینی، قوتِ ایمانی اور علمی گہرائی کی وجہ سے۔ (گو وہ بہت سے علم و تمدن کے دعوے داروں کی نگاہ میں تنگ نظر تھے۔) ان لوازمات کو جنہیں ایرانیوں نے اپنے اوپر مسلط کر لیا تھا، طوق و سلاسل، پیروں کی بیڑیاں اور گلے کا پھندا سمجھ رہے تھے، وہ اس سے پوری طرح واقف نہ تھے مگر جتنا جانتے تھے وہ بہت تھا اور شہادت کے لئے کافی تھا۔ اور اسی اعتماد و بنیاد پر انہوں نے کہا کہ اے ایرانیوں اللہ نے ہم کو بھیجا ہے کہ تم کو دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف نکالیں، تمہاری خود بینی تم کو دھوکے میں نہ ڈالے، ظاہری نمود و نمائش تمہیں فریب نہ دے، تم پنجرہ میں زندگی گزار رہے ہو پنجرہ ہے چاہے وہ سونے ہی کا کیوں نہ ہو اور خواہ وہ خوبصورت قیمتی شیشے کا بنا

---

[1] حضرت عمرؓ نے اپنے بعض عرب عاملوں کو جو عجمی ملکوں میں تھے لکھا تھا کہ تم عجمیوں کی خو بو اختیار کرنے سے بہت بچنا، تم دھوپ میں رہنے کی عادت رکھو کہ وہ عربوں کا حمام ہے، تم معد بن عدنان کا رہن سہن اپناؤ، موٹا جھوٹا کھاؤ اور موٹا جھوٹا پہنو۔ (رواہ البغوی عن عثمان النہدی)

ہوا ہو اور وسعت میں کسی شہر کے برابر ہو لیکن ہے تو وہ پنجرہ ہی جیل خانہ کیا ہے؟ وہ قید خانہ کیوں کہلاتا ہے کیا وہ وسیع نہیں ہوتا۔؟ کیا اس میں کمرے نہیں ہوتے جو عام طور پر متوسط طبقہ کے لوگوں کو میسّر نہیں ہوتے، اس سب کے باوجود وہ قید خانہ ہی کہلاتا ہے۔ ہم میں سے کوئی شخص جیل میں رہنا پسند نہیں کرتا چاہے وہاں لطف و راحت کے کتنے ہی سامان مہیا ہوں، اور خواہ وہ کتنا ہی کشادہ اور وسیع ہو، اس میں پارک و چمن ہوں، جھیل و تالاب ہوں، اور میوزیم و تفریح گاہیں ہوں۔

دوستو! یہ صاحب فہم و ذکا اور باشعور عرب مسلمان جو احساسِ کمتری کا شکار نہیں تھا۔ جو شکست خوردگی اور خود اعتمادی کے فقدان سے بالکل محفوظ تھا، وہ مردِ مومن اگر اس وقت تک زندہ ہوتا تو مغربی تہذیب کی تقلید اور عیش و تنعم کی اس زندگی کو جو عرب اور بہت سے اسلامی ملکوں کے مسلمان گذار رہے ہیں اسی نظر سے دیکھتا جس نظر سے رومی و ایرانی تمدن کو دیکھتا تھا۔ اور ان پر ایسے ماتم کرتا جیسے اس نے رومیوں اور ایرانیوں پر ماتم کیا تھا، اور فکر و آرزو کرتا کہ ان کو دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف لائے۔ جیسے اس نے رومیوں اور ایرانیوں کے لئے تمنا کی تھی۔

یہ عرب مسلمان آزادی کی وہ پُر لطف زندگی گذار رہا تھا جو اسلام نے عطا کی تھی اور جس نے اسے تنگ و محدود اور گھٹتی ہوئی دنیا سے نکالا تھا، پیٹ اور مادہ پرستی کی دنیا، اغراض و خواہشات کی دنیا، بندگی و بندہ سازی کی دنیا، اسلام نے ان کو مٹنے والی دنیا، فانی، افکار و امراض اور غم و آلام کی بے لطف دنیا سے نکال کر وسیع و لامحدود دنیا میں پہنچا دیا تھا، وہ تھی ایمان و یقین کی دنیا، قلب و روح کی دنیا، قربانی و دستگیری کی دنیا، عدل و مساوات کی دنیا، رحم و کرم کی دنیا، دلبری و اخلاص کی دنیا، بقاء و دوام کی دنیا، وہ دنیا جس میں تکدر و بے لطفی نہیں، جس میں خوف و اندیشہ نہیں، رنج و غم نہیں۔

حضرت ربعی بن عامرؓ کو دنیا کی یہ وسعت اور اس کا وہ لطف و مزہ حاصل تھا جس سے رومی و ایرانی دونوں محروم تھے، اور ان کو روم و ایران کا تمدن اور ان کی زندگی ایک تنگ پنجرہ معلوم ہو رہی تھی، جس میں ایک آزاد و حوصلہ مند انسان اور صاحبِ عقل و شعور مومن کا دم گھٹنے لگے، جیسے مچھلی کہ اگر اس کو پانی سے نکال دیا جائے تو چاہے کتنے ہی گداز و ملائم بستر، یا سونے کی شاندار ڈبیا میں رکھ دیا جائے مگر اس کا دم گھٹنے لگے گا۔

حضرات یہ تو ایک بادیہ نشین مسلمان کا نقطۂ نظر تھا جس نے تپتی ہوئی ریت اور جھلستے ہوئے صحرا کے سوا کچھ نہیں دیکھا تھا، مگر ہم پڑھے لکھے اور مہذب و شائستہ لوگوں کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ پروفیسرو یونیورسٹیوں کے لیکچرار و تعلیم و تربیت کے علم بردار، صحافیو اور یورپ کا دورہ کرنے والو، بتاؤ کہ ہم!

موجودہ، بے روح اور کھوکھلی تہذیب کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔؟ ہمارے نقطۂ نظر اور اس صحرانشین مردِ مومن کے نقطۂ نظر میں کوئی مناسبت ہے۔؟ جو دنیا سے اتنا واقف نہ تھا جتنا ہم واقف ہیں، جس کی تاریخ پر ایسی گہری نظر نہ تھی جیسی ہماری ہے، وہ قوموں کے حالات و تجربات سے اتنا واقف نہیں تھا جتنا ہم واقف ہیں، اس نے نہ فلسفہ پڑھا تھا اور نہ ہماری آپ کی طرح اس پر گہری نظر رکھتا تھا۔ اس کا راز یہ ہے کہ اس کے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور دینِ اسلام نے اعتماد خود داری، ایمان و جوانمردی کی دولت بھر دی تھی، انہیں دنیا کی بے بضاعتی کا یقین اور حقیقت شناسی کا جوہر عطا کیا تھا، یہ مردِ مومن اس وقت کی موجودہ دنیا کے سپہ سالارِ اعظم "رستم" جس کے نام سے دل لرزتے تھے۔ کسریٰ کے بعد اس کا جاہ و جلال تھا، ایران کے تمام سپہ سالاروں اور حکام پر اسی کا سکہ چل رہا تھا، اس سے وہ بوریہ نشین اور صحرا نورد مومن، جرأت و بے باکی اور حقارت و استخفاف سے بھرپور لہجہ میں یہ کہہ سکتا تھا کہ رستم مجھے تم پر ترس آتا ہے، تمہاری حالت زار سے میرا دل بھر آتا ہے، تم بے معنی رسوم و رواج کے پھندوں میں جکڑے ہوئے ہو، تم دنیا کی تنگی میں ہو اور ہم عرب جن کے جسم نیم برہنہ تلوار کی نیامیں بوسیدہ و کرم خوردہ، کپڑے پھٹے ہوئے پیوند زدہ اور جوتے ٹوٹے ہوئے ہیں، اس سب کے باوجود ہم جنت میں ہیں اور عیش کی زندگی گذار رہے ہیں اور تم عذاب جہنم کی زندگی گذار رہے ہو۔

بھائیو! آخر کس قوت و طاقت، کس جذبہ و حوصلہ نے ان سے یہ جرأت مندانہ اور طاقتور بات کہلوائی، وہ کیا جوہر تھا جس نے ان سے یہ جھنجھوڑنے اور لرزہ براندام کر دینے والا جملہ کہلوایا۔ یہ ان کی ایمانی طاقت، ان کی خود اعتمادی اور اس پیغام و تعلیم کا کرشمہ تھا جس سے خدا نے ان کو نوازا تھا۔

دوستو! ہم میں کتنے ایسے لوگ ہیں، خدارا آپ بتائیں کہ ہماری یونیورسٹیوں اسکولوں، دفتروں، شعر و ادب اور صحافت کے میدان میں کتنے ایسے لوگ ہیں جو کسی یورپین یا امریکن کو اس لب و لہجہ میں مخاطب کر سکیں جو ہمارے ہی خوشہ چیں ہیں ہم ہی ان کو پال رہے ہیں۔ اگر یہ پٹرول نہ ہوتا جو آپ کے جزیرہ میں ابل رہا ہے، تو کسی امریکن و یورپین کو یہ قوت و غلبہ ہرگز نہ حاصل ہوتا، وہ یورپین جن کے ایمان و اخلاق اور خود شناسی کا دیوالیہ ہو چکا ہے، جو اس وقت اخلاقی جذام میں مبتلا ہے، اور جس کی وجہ سے اس کی تہذیب و ثقافت تعفن و بدبو کا شکار ہے، اور اسکی سمجھ میں اس کا کوئی علاج نہیں آرہا ہے۔ اور نہ وہ اس پر کوئی کنٹرول کر پا رہا ہے، وہ ایک ہوشیار، خود غرض اور نفع خور تاجر ہے، وہ مدتوں پہلے اپنی گردن سے عیسائیت کا قلادہ اتار چکا ہے حسن اخلاق، انبیاء کرام، اور آسمانی مذاہب سے تعلق کا اس کا آخری دھاگہ بھی ٹوٹ چکا ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود ہم اس کو اکرام و اعزاز اور تقدس و معبودیت کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور خود کو، اپنی تہذیب کو، اخلاقی قدروں اور اپنے ذہن کو، ان کی تہذیب و قدروں کے سامنے حقیر سمجھتے ہیں، اور اس کے سامنے اس طرح بے حقیقت ہو جاتے ہیں جیسے سورج کے سامنے شبنم پگھل جاتی ہے، یا آگ کی لو کے سامنے موم پگھل جاتا ہے۔

یہ عرب مسلمان جس نے اپنے جوہر کو پہچانا، اپنے پیغام کی قیمت و اہمیت کو پہچانا وہ رستم سے کہتا ہے کہ خدا نے ہم کو بھیجا ہے کہ اس کے بندوں کو دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف نکالیں۔ ان کا یہ جملہ ایسا قیمتی و باوزن ہے کہ پہاڑ بھی اس کو نہیں سہار سکتے اور سمندر پر رکھ دیا جائے تو وہ دھواں دھواں ہو جائے، تو دل و ضمیر پر کیا گذرے گی۔ دعوت اسلامی کے دورِ اوّل میں ایک باشعور مردِ مومن اپنے عہد کی بے جان تہذیبوں کی طرف جس نقطۂ نظر سے دیکھ رہا تھا، آج بھی ایک باشعور و صاحبِ ایمان شخص کو اپنے عہد کی بے حقیقت اور حقیر تہذیبوں کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیئے۔

دوستو! آج ہم آپ سے بس اتنا ہی کہنا چاہتے ہیں، اور اس جگمگاتے اور خوبصورت شہر میں جو اچانک صحرا سے نکل کر گل بداماں ہو گیا، اور ترقی و عروج کو پہنچ گیا، میں اس مردِ مومن کا یہ جملہ بطور تحفہ و امانت پیش کرتا ہوں۔ یہ صدا میں نے یہاں لگائی ہے۔ مگر میری آرزو و تمنّا یہ ہے کہ یہ آواز دنیا کے کونے کونے میں گونج جائے۔ اللھم اشھد۔

عربوں کو اور مشرق و مغرب میں جہاں کہیں بھی مسلمان رہتے ہیں۔ انہیں اس موجودہ بے جان اور کھوکھلی تہذیب کو جو ہمارے گرد و پیش چھائی ہوئی ہے، اسی مومنانہ اور خود دارانہ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ ہم کوئی طفیلی اور مجہول النسب لوگ نہیں ہیں۔ ہم اچانک زمین سے نہیں نکل آئے ہیں کہ ہمارا کوئی حسب نسب اور جڑ بنیاد نہ ہو۔ ہم ایسے نہیں کہ ہمارا کوئی ورثہ و سرمایہ نہ ہو، ہماری کوئی تہذیب و تاریخ نہ ہو، نہ ہمارے اسلاف ہوں نہ شرف و منزلت۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں۔ دوستو! ہم پر فضل و کمال سے مالا مال بلکہ نہال ہیں۔ ہم ساری دنیا کے اتالیق ہیں، قوموں کے رہبر و رہنما میں ہم وہ ہیں کہ ہے حقیقت جس کے دین کی احتساب کائنات۔

مگر دوستو! اسوقت دل تھام کر یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ ؎

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی

ہم پر مغربی تہذیب کا ایسا جادو چلا ہے، کہ ہم استاذ سے شاگرد بن گئے ہیں، کل ہم ستاروں کو نشانِ راہ بتاتے تھے، اور آج ہم خود وہی یورپ کی بتائی ہوئی راہ پر چل رہے ہیں، ہماری بانگ ڈور دوسروں

کے ہاتھ میں ہے، دوستو! یہ کتنی دل خراش حقیقت ہے کہ پردہ کے پیچھے سے ڈوری ہلائی جارہی ہے، اور ہم مداری کے بندر کا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔

خدا ہمارے مسلمان عرب مؤرخوں کی قبر کو نور سے بھر دے۔ جنہوں نے ہمارے لئے اس جاوداں جملے کو محفوظ کر دیا۔ یہ جملہ ہمارے اسلاف کی بلند ہمتی اور قوت ایمانی کی سچی تصویر پیش کرتا ہے، جنہیں خدا نے اسلامی پیغام سے نوازا تھا اور انہیں اس پر فخر و ناز تھا اور وہ اسے ہر شئے سے افضل و برتر سمجھتے تھے، ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جو چیز اس سرچشمہ سے نہیں نکلتی یا اس سے اس کا رشتہ و تعلق نہیں اسکی نہ کوئی قدر و قیمت ہے نہ اس کو ثبات و دوام ہے۔

دوستو اور بھائیو! موجودہ تہذیبوں کے مقابلے میں، اور اس چیلنج کے مقابلے میں جو اس تہذیب اور موجودہ فلسفوں کی طرف سے ہوتا رہتا ہے، ہمارا بھی وہی موقف ہونا چاہئے جو اس مرد مومن کا تھا، ہمارا موقف ایک بلند قامت انسان اور باعزت غیور اور خوددار شخص کی طرح ہونا چاہئے جس کو اپنی شخصیت اور اپنے پیغام پر ناز ہو، جو اپنی عقل سوجھ بوجھ اور خداداد صلاحیتوں سے کام لیتا ہو، جو اس تہذیب کے تسلیم کرنے اور اس کے رد کرنے میں آزاد و مختار ہو، اس کی مفید و بے ضرر چیزوں کو (جو اس کے مقاصد اور قدروں سے میل کھاتی ہوں، اس کے منافی نہ ہوں بلکہ مزید قوت و طاقت پہنچاتی ہوں نہ کہ اس کے ڈھانچہ کو کمزور دکھو کھلا کرتی ہوں) اپنائے اور اسکی مضر چیزوں سے بے تعلق رہے، ان کے مقابلہ میں ہمارا موقف ایک باشتیہ کا سا نہ ہونا چاہئے جو خود اعتمادی کی دولت کھو چکا ہو، اور دولت ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہو، ہر قوت و طاقت کے سامنے سپر انداز ہو جاتا ہو، اسے زندگی سے عشق اور موت سے نفرت ہو، خطرپسند مہم جوئی اور حوصلہ مندی کی صلاحیتوں سے محروم ہو اور حقیقت پسندی، جدت آفرینی اور قیادت و پیشوائی کے جوہر سے خالی ہو، ایسا شخص موجودہ بے روح تہذیب کو اس طرح للچائی ہوئی نگاہ سے دیکھتا ہے، جیسے کوئی چھوٹا بچہ دامن کوہ میں کھڑا اس کی چوٹی کو دیکھ رہا ہو اور تمنا کرے کہ کاش اس پر چڑھ سکتا۔

میں اپنی گفتگو کا سلسلہ شاعر اسلام "ڈاکٹر محمد اقبال" کے شعر پر ختم کرتا ہوں جس میں انہوں نے اس پڑھے لکھے مسلم نوجوان کو مخاطب کیا ہے جو مغربی تہذیب سے مرعوب سحور ہو کر اپنی شخصیت کھو بیٹھا ہے اور اس کی وسعت و گہرائی اور اسرار و رموز اور خوابیدہ صلاحیتوں سے ناواقف ہو کر مادیت کا دلدادہ و شیدائی ہو گیا ہے اور موت کے خوف میں زندگی گذار رہا ہے۔ ذرا غور سے سنئے اقبال کیا کہہ رہے ہیں ؎

بینی جہاں را خود را نہ بینی — تا چند ناداں غافل نشینی
نور قدیمی، شب را بر افروز — دست کلیمی در آستینی
بیروں قدم نہ از دور آفاق — تو بیش ز بینی تو پیش از بینی
از مرگ ترسی اے زندہ جاوید — مرگ است صید سے تو در کمینی
جانے کہ بخشند دیگر نہ گیرند — آدم بمیرد از بے یقینی